Mujalla Islami Fikr-o-Tahzeeb (MIFT)

Volume 5 Issue 1, Spring 2025

ISSN(P): 2790 8216 ISSN(E): 2790 8224

Homepage: https://journals.umt.edu.pk/index.php/mift

Article QR

دینِ اسلام کی آفاقی تعلیمات اور پاکستانی سماج کی متنوع شناخت

Title: **The Universal Teachings of Islam and the Diverse Identity of Pakistani Society**

Author (s): [1]Muhammad Riaz

Affiliation (s): [1]University of Baltistan Skardu, Baltistan Pakistan.

DOI: https://doi.org/10.32350/mift.51.02

History: Received: Jan 21, 2025, Revised: Mar 23, 2025, Accepted: April 15, 2025, Published: June 27, 2025

Citation: Irfan, Riaz. "The Universal Teachings of Islam and the Diverse Identity of Pakistani Society." *Mujalla Islami Fikr-o-Tahzeeb* 5, no. 1 (2025): 16–30. https://doi.org/10.32350/mift.51.02

Copyright: © The Authors

Licensing: This article is open access and is distributed under the terms of Creative Commons Attribution 4.0 International License

Conflict of Interest: Author(s) declared no conflict of interest

A publication of
Department of Islamic Thought and Civilization, School of Social Sciences and Humanities University of Management and Technology, Lahore, Pakistan

دینِ اسلام کی آفاقی تعلیمات اور پاکستانی سماج کی متنوع شناخت

The Universal Teachings of Islam and the Diverse Identity of Pakistani Society

Muhammad Riaz*

University of Baltistan Skardu, Baltistan Pakistan

Abstract

This research article primarily elucidates two aspects. The first aspect attempts to provide a genuine interpretation and understanding of Islam. While this endeavor is not overly extensive or heatedly debated, it does point out significant key points. These points either encompass the fundamentals of Islam or elaborate on its ethics and principles. In this way, the discussion covers not only the overarching matters of Islam but also specific details that highlight the distinct and guiding nature of Islam compared to other religions. The second aspect is presented in considerable detail. This is crucial because we are all witnesses to the uncertain situation in Pakistani society. This society is neither striving to become religiously literate nor showing enthusiasm for modern scientific understanding. Instead, every individual here seems to lead a life that, while exhausting, also immerses them in the deep sea of futility. Their preferences are unclear, and their goals remain unattained. They engage in activities masked as 'busyness,' which cannot sustain fulfillment. Furthermore, there are abundant reasons for concern. Additionally, another significant reason for the malaise in Pakistani society is the overwhelming emotional factor. Rather than nurturing a spirit of various religious beliefs and sects, pathways leading to extremism are being paved. Under such circumstances, instead of fostering ideas and theories, outdated dogmas and factions thrive, leading to an individualistic mindset that erodes the concept of national unity. This research article is structured to clarify and highlight these observations. It is hoped that it will prove useful for researchers focusing on the intersections of religion and society, if not in entirety, at least in certain aspects.

Keywords: Islam, Universality, Society, Diversity, Pakistan.

۱. تمہید

بحیثیت مسلمان ہم مدعی ہیں کہ ہمارا دین ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ ہمارا سماج متوازی معیار سے ہٹ کر غیر معیاری اُصولوں (فساد و دنگل، فرقہ واریت و مسلکی رنگ) پر رواں دواں ہے۔ ہم اپنے پاکستانی سماج کی طرف نظر کریں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ ہم تنقیدی نگاہ تو بڑی وسیع رکھتے ہیں لیکن عملیات کی طرف بڑھنے کی توفیق ہمیں قطعی نہیں ہوتی۔ سماج کے جتنے بھی ذمہ داران ہیں اُن کی ہر ہر حرکت پر گہری نظر رکھنا اور پھر اُن کو مختلف نقائص کی طرف نسبت دینا ہمارا شیوہ بنتا جارہا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ آج کی سائنسی زندگی نے ہمارے لئے سہولیات تو بہت فراہم کی ہیں لیکن درست نشاندہی نہ ہونے اور عدم توجہی کی بناء پر سماج کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہوتی جارہی ہیں،

خصوصیت کے ساتھ مسلم سماج آج اُس نہج پر نہیں ہے جہاں اُس کو ہونا چاہیے تھا۔ وہ سماج جہاں اکائی نظر نہ آئے اور ہَرج مَرج کا سماں ہو، وہاں قوموں کے اقدار واُصول بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

*Corresponding author: muhammad.riaz@uobs.edu.pk

بلکہ میں تو یہاں تک دعویٰ کرنے لگا ہوں کہ وہ سماج نابودی کی طرف جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق سے اُن کا نام و نقش تک مٹ جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ قومیں قائم ودائم رہتی ہیں جو سماجی اکائی کو نہ صرف ثابت قدم رکھتی ہیں بلکہ سماجی تمدن کو نمایاں رکھنے کی راہیں بھی تلاش کرتی ہیں۔ ہم اپنی دُنیا میں اِس قسم کی مثالیں بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

2۔ بنیادی سوالات

تحقیق کے بنیادی اُصول میں سے ایک اصل "سوال" ہے اور وہ سوال لائقِ توجہ قرار پائے گا جس کا جواب منطقی اعتبار سے قابلِ قبول ہو۔ اِس تحقیقی مقالہ کو تین اہم سوالات کے محور پر ترتیب دیا گیا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) انسان کی خلقت کا اصل راز کیا ہے اور اِس راز کو دین و مذہب سے منتھی کرتے ہوئے مدعی ہوں گے کہ اِنسانیت کی یہ خلقت دراصل رب کی بندگی اور شناخت کا وسیلہ تھی۔ دوسری جانب مذہب و مسلک و فرقہ کی بنیاد پر انسانیت کے لئے باعثِ ننگ و عار ثابت ہونا درست "مسلمانیت" ہے؟

(۲) کیا پاکستانی سماج میں مذہبی و مسلکی منافرت کی اصل وجہ دین و مذہب سے لاتعلقی اور علومِ جدیدہ سے بے اعتنائی ہے یا دین کو صرف آلہ کے طور پر استعمال کرنے کی روش عام ہے؟

(۳) کیا سماج میں عدمِ برداشت کا رویہ اِس لئے پھیل رہا ہے کہ یہاں کے مسلمان دین شناس یا تربیت یافتہ ہونے کے بجائے صرف جذباتیت کے خول میں مُقید ہو چکے ہیں؟

3۔ طریقہ ٔ تحقیق

یہ تجزیہ و تحلیل اور مشاہدہ پر مبنی تحقیق ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پاکستانی سماج سے متعلق بحث ذاتی مشاہدات و آراء کی شاخسانہ ہے۔ اِس مقالہ کی تکمیل کے لئے نہ تو سوالنامہ سے مدد لی گئی اور نہ ہی کسی صائبِ رائے شخص سے انٹرویو لینے کی ضرورت محسوس کی گئی بلکہ تجزیہ و مشاہدہ کو بنیاد بنا کر ایک تحقیقی مفروضہ قائم کیا گیا اور بعدازاں تکمیل کی طرف بڑھنے کے لئے تجزیاتی و مشاہداتی طریقہ ٔ تحقیق کو وافی و شافی سمجھا گیا۔

۴۔ خلقتِ کائنات اور انسانیت

ہم انسان جو اِس کائنات کے نزدیکی رشتہ دار ہیں، ہمیشہ سے کھوج کی ٹوہ میں رہے ہیں۔ کائنات کی وسعتوں اور اس کے عظیمُ الشان نظائر کی چھان بین ہم اِنسانوں کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ ہمیں دھیان میں رکھنا ہوگا اُس وقت کو جب کائنات نے آغاز کیا ہوگا اور تعجب میں رہی ہوگی کہ میری خلقت کا اصل راز کیا ہے؟ پھر تسلی ہوئی ہوگی کہ چلو کوئی مخلوق تو ہے جو میری رنگینی کا باعث بنے گی اور بعد ازاں کائنات کو پتہ چل گیا کہ وہ مخلوق انسان تھا۔ بعض دوسرے موارد میں بیان کیا گیا ہے کہ جیسے ہی انسانی خلقت کے لئے مٹی کے اِنتخاب کا مرحلہ آیا تو زمین معترض ہوئی اور جبرئیل امین سے فریاد کرنے لگی کہ :"اے خدا کے مقرب فرشتے مجھے یہ بات سخت ناگوار اور میرے لئے سخت تکلیف دہ ہے کہ مجھ سے بنی ہوئی مخلوق کی نسل جہنم میں جائے گی، اِس لئے میں درخواست کرتی ہوں کہ تو مٹی لے جانے سے باز رہ اور بارگاہِ احدیت میں میری عرضداشت پہنچادے۔"[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی خلقت کا زمین و مٹی سے گہرا تعلق ہے، البتہ یہ تعلق انسانیت کی خوش قسمتی سے زیادہ امتحان و آزمائش سے مُعلَّق ہے۔ مٹی کو بھی اندازہ تھا کہ انسانیت کی خمیر میں بغاوت ہوگی۔ وہ خدا کی نافرمانی میں پیش ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے اُمور انجام دے گا کہ نہ صرف انسانیت شرما جائے بلکہ زمین و مٹی بھی تھر تھر کانپ اُٹھے۔ زمین بچھ گئی۔ مٹی کی خوشبو چار سو پھیلنے لگی اور انسانیت کی خلقت کا عمل بھی کامیابی کے ساتھ مکمل ہوا۔ بن گیا حضرت آدمؑ کا نقشہ (مجسمہ)، وہ نقشہ کہ جس کی تمام تر تزئین و آرائش مٹی سے ہی کی گئی تھی، چار الگ الگ جگہوں سے مٹی اکٹھی کرنے کے بعد نبی خدا آدمؑ کو پتلے کا درجہ ملا۔ تخلیق ہوگئی اماں حوائی بھی۔ دونوں جنت میں عیش و آرام اور سکونت کی زندگی گزار رہے تھے کہ یکایک ربِ کائنات کی منشاء کے مطابق دونوں کو زمین کی طرف رُخصت ہونے کا حکم ہوا۔ یہاں پر ہماری بحث یہ نہیں کہ حضرت آدمؑ کے ترکِ اولیٰ کا کیا بنا، ہم اُس بات کی طرف اشارہ کئے بغیر وہ مقصد بیان کریں گے کہ جس کے لئے آدمؑ کی خلقت کی گئی تھی۔ یعنی کہ ربِ جلیل کے اُس فرمان کے مطابق کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں[2] کو تمام تر انسانی جامعیت اور مقصدیت کا ہدف قرار دیں گے اور پھر اِنسانی معراج کو دین و مذہب سے منتہی کرتے ہوئے مدعی ہوں گے کہ اِنسانیت کی یہ خلقت دراصل رب کی بندگی اور شناخت کا وسیلہ تھی، قطعِ نظر اس کے کہ اللہ کی پہچان اِس

---

[1]۔ کراروی، سید نجم الحسن، تاریخ اسلام، (لاہور، امامیہ کتب خانہ، ۱۹۷۴ء)، ص:۵۸

[2]۔ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (سورہ بقرہ، آیت:۳۰) اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں اپنا نائب (خلیفہ) بنانے والا ہوں۔ مترجم: قادری، ڈاکٹر محمد طاہر، منہاج القرآن، (لاہور، منہاج القرآن پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص:۲۸، اس آیت میں زمینی خلافت کا اعلان ہو رہا ہے اور انسانوں کے اِنتظامی معاملات کی بنیادی بھی پڑ رہی ہے۔

بندگی کی کس قدر محتاج تھی۔ بہر حال کائنات کی تخلیق اور پھر اُس وسیع کائنات میں انسان کی خلافت دونوں کا تال میل اس بات کا غماز تھا کہ عنقریب دین و مذہب کا آغاز ہوا چاہتا ہے، خاص طور پر دینِ اسلام کی بنیاد رکھی جارہی ہے کہ اس دین (اسلام) سے قبل دیگر مذاہب کو مقدمہ کی حیثیت سے متعارف کروایا جارہا ہے۔ ایک ایسا دین (اسلام) کہ جس کی شان و شوکت کو نمایاں رکھنے کے لئے ربِ جلیل نے بڑا اہتمام کیا، اِس کے نبی مکرمؐ کو تمام انبیاء علیہم السلام کا سید و سردار بنایا[3]، اُس دین کے ماننے والے اور اتباع کرنے والے اخلاق و شرف میں کس قدر بلندی پر ہوں گے اور انسانیت کے احترام میں کس درجے پر فائز ہوں گے، وہ سوچنے اور تفکر کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا دینِ اسلام کی تمام تر تعلیمات اور مجموعہ نچوڑ دکھی انسانیت کی خدمت و عزت اور شرف ہے۔

مندرجہ بالا رُشحات کے تناظر میں تو واضح ہوگیا کہ مُسلمانیّت کا شیوہ تو دُکھی اِنسانیت کا مداوا ہے۔ جس نبیؐ مُکرّمؐ کے دین میں احترام انسانیت کا اعلیٰ درس موجود ہو، اُس کے ماننے والے، کٹ مرنے والے اور حد درجہ چاہ کے دعویدار سڑکوں کے مُجاہدین، جلاؤ گھیراؤ کے ماہرین اور فساد فی الارض کے شائقین بن گئے ہیں۔ کہاں وہ درسِ انسانیت کہ جس میں کسی کو ذرا سی بھی کھروچ پہنچانے کی ممانعت ہے[4] کہاں یہ سوفسطائیت کہ ہم سے اُلجھو گے تو بھسم کر دیں گے، ہم سے ٹکر لو گے تو ختم کر دیں گے۔ صد افسوس کہ آج کی مُسلمانیت (پاکستان کے تناظر میں)اِس جبلّت (سوفسطائیت) کی طرف رُجحانِ شدیدہ رکھتی ہے۔ جب اِنسان آپے سے باہر ہوجاتا ہے تو "سب کچھ" کر گزرنے کی حدیں پار کرلیتا ہے۔ وہ نہ اخلاقیات کا لحاظ رکھتا ہے نہ نقصانات کی فکر کرتا ہے۔ جو جہاں ہے، جس شکل میں ہے، ہر اِک اثر بے اثر ہوجاتی ہے۔ پاکستان میں مذہبی شخصیات پہلے بھی گرفتار ہوئیں ہیں۔ پہلے بھی لوگوں نے صدائے احتجاج بُلند کی ہے۔ ایک گرفتاری[5] پر آپ اس قدر آگ بگولہ ہیں تو پھر جن کے پیارے قتل ہوئے یا نظروں سے اوجھل

---

[3]۔ سیوطی، جلال الدین، الخصائص الکبریٰ فی معجزات خیر الوری ' ، ج 1، (مترجم: نعیمیؔ، سید غلام معین الدین)، (لاہور، مکتبہ اعلیٰ حضرت، 1426ھ بمطابق 2006ء)، ص: 49

[4]۔ اللہ کے نبیؐ جب کبھی کسی جنگ کے لئے کوئی لشکر روانہ فرماتے تھے تو پہلی نصیحت ہی یہی ہوتی تھی کہ خبردار! کسی بے گناہ پہ ہاتھ مت اُٹھانا، کسی بھاگتے ہوئے انسان کو نقصان مت دینا، بچے، بزرگ اور خواتین پر ہاتھ مت اُٹھانا، یہاں تک کہ اللہ کے نبی نے پھل دار درخت کاٹنے سے بھی منع کیا ہے۔ **بحوالہ:** طوسی، ابی جعفر محمد بن الحسن، تہذیب الاحکام، ج ۶، (بیروت، دارالتعارف للمطبوعات، ۱۹۹۲ء)، ص: ۱۳۸

[5]۔ تحریک لبیک پاکستان کے سربراہ خادم حسین رضوی کی وفات کے بعد ان کا بیٹا سعد رضوی تنظیم کا سربراہ بنا۔ البتہ اُن کی تعیناتی کے بعد حکومتِ پنجاب نے نقص امن کے تحت موصوف سمیت تنظیم کے متعدد رہنماؤں کو گرفتار کیا، گرفتاری کو بنیاد بنا کر پاکستان بھر میں پُر تشدد مظاہرے ہوئے اور کئی شہروں میں ہنگامہ آرائی کی

کر دیئے گئے، وہ کتنے جبری و جذباتی ہونے چاہئیں تصور کرنا بھی مُحال ہے۔ پھر تو اس طبقہ میں کہ جس کے پیارے اللہ کو پیارے کر دیئے گئے، جارحیت کی اِنتہاء، انارکیّت (انارکی) کا عروج اور جلانے کی، ہر شئی کو راکھ بنانے کی طوفانی جبلّت ہونی چاہیئے۔ اِس لئے کہ ہر ایک کو اپنے عزیزوں سے رشتۂ ازلی ہے۔ وقت گزاری کا رشتہ کوئی نہیں رکھتا۔ قانونی تقاضوں کی خانہ پوری اور دستوراتِ پاکستانیات کی روشنی میں نُقصِ امن کو محو کرنے کے لئے ریاست بعض اوقات سخت اقدام اُٹھاتی ہے۔ وہ شخص کہ جس کی گرفتاری کے بعد پاکستان کے حالات گھمبیر ہو گئے، وہ ملکی سالمیت سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا قتلِ انسانیت سے بھی زیادہ حُرمت رکھتا ہے؟ یہ سوال آج کے ہر مُسلمان سے ہے جس کے تیئں خیال ہے کہ وہی حقیقی مُسلمانیت کا یقینی چہرہ ہے۔

اس طبقہ کو (اوّل الذکر جارحین جنہوں نے گرفتاری کو جواز بنا کر سب کچھ اپنے لئے رواء سمجھا) دینِ محمدیؐ اور اخلاقیاتِ نبویؐ میں جوازِ عمل کا کوئی ثبوت تو نہیں ملے گا البتہ خود ساختہ اور دینِ مبین سے ہٹ کر کئی سو جواز تراشے جاسکتے ہیں۔ یہی جواز کیا کم ہے کہ اُن کا رہنماء ور ہبر گرفتار کیونکر ہوا؟ ابھی اُس شخص نے رہبری و رہنمائی کے گُر صحیح سے ازبر بھی نہیں کئے ہوں گے، باپ کی گدی نشینی وراثت میں مل گئی اور حادثاتی طور پر بعض لوگوں کے امیرِ دین و دُنیا بن گئے۔ لیکن مجال ہے کہ آپ ایسے رہبر و رہنماء کے خلاف کوئی اقدام کریں گے۔ کراچی میں گاڑی بردار شخص ان افراد کے نرغے میں آگیا۔ آگے کی طرف جانا چاہے تو بھی ڈنڈا بردار اور عقب کی طرف بھی ڈنڈوں کے حصار میں، بے قصور شخص کا بس یہی قصور تھا کہ اُس نے شاہراہِ احتجاج کو اپنی ضرورت کے لئے استعمال کرنے کی جارت کی۔ بندہ گاڑی میں موجود ہے، باہر سے ڈنڈوں ہی ڈنڈوں کی بارش ہو رہی ہے۔ جُملوں کی بوچھاڑ اور زبان کی مغلظات کے بیچوں بیچ ایسا لگ رہا تھا کہ ہماری مُسلمانیّت جدید تہذیب کی بُنیاد رکھ رہی ہے۔

ایک مقام پر وردی میں ملبوس تین سپاہی متعدد افراد کے اسلامیائی (اسلام کی آغوش میں) حصار میں ہیں۔ مُشتعل ہجوم کلمہ پڑھوا رہا ہے، تینوں سپاہی زخمی ہیں اور زخموں کی نمک پاشی کرتے ہوئے اُن کو "زبردستی - زبردست قسم کے مسلمان" بنانے کی سعی کی جا رہی ہے۔ بعض ہنگامہ خیز واقعات کے نتیجے میں تین اہلکار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ متعدد جھڑپوں اور باہمی جھگڑوں میں سینکڑوں پولیس جوان

صورتِ حال پیدا ہوئی۔ **بحوالہ:** اعزاز سید، تحریک لبیک کے سربراہ سعد رضوی کی گرفتاری: حکومت جیتے گی یا تحریک لبیک کے سعد رضوی؟، مشمولہ: بی بی سی اُردو ویب، (لندن، برطانیہ)، ۱۳ اپریل ۲۰۲۱ء

شدید زخمی ہوگئے اور اُنہیں ملک کے مختلف اسپتالوں میں علاج کے لئے داخل ہونا پڑا۔[6] گویا فتح یاب مُسلمان میدانِ جہاد میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے ابھی ابھی گھر لوٹے ہیں۔ ایک وہ کردار کے غازی (صحابہ کرام) جنہوں نے جہادِ فی سبیل اللہ میں بھی انسانیت کا خیال رکھا[7] اور ایک یہ ہمارے غازیانِ دین کہ راہ چلتے انسان کو بھی نہ بخشیں۔ یہ ادائیں ہمیں مسلمان ثابت کرتی ہیں؟ صرف زبان سے کہہ دیا تو کیا حاصل، عمل سے بھی تو آشکار ہونا چاہیے کہ ہم مُسلمانیت کے حقیقی رُخ ہیں۔ اور عمل تو اُس دن سے روٹھ چُکا ہے جس دن ہم نے حق اور سچ کے درمیان فرق ختم کر دیا، اچھے اور بُرے کی تمیز مٹادی، علم اور جہالت کو یکسو دیکھا اور سب سے بڑھ کر مسلکی مُنافرت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

مندرجہ بالا چیدہ چیدہ مثالوں کے تناظر میں ہمارے تئیں بعض نِکات منصہٴ شہود میں آتے ہیں اور وہ نِکات اس لئے بھی بیان کرنا ضروری ہے تاکہ موضوع کی موزونیت و معرفت نمایاں ہوسکے۔ کسی بھی کلام میں اختتامیہ بڑا معنی رکھتا ہے۔ وہ کلام کہ جس کا آغاز فصاحت و بلاغت سے ہو لیکن اختتام سطحی باتوں اور نظریات سے ہو تو اُس کلام کی وقعت ختم ہوجاتی ہے۔ بجائے اِس کے کہ وہ کلام پُر تاثیر ہو، بے مقصدیت کی سمندر میں غرق ہوجاتا ہے۔ پھر قباحتوں اور نہ سمجھنے والے ماحول میں اپنی بات رکھنا اور پھر اُس بات کو حقیقت کی طرف لے جانا بہت مُشکل ہوتا ہے۔ میں تو صرف رب کے بھروسہ پر تبدیلی کی اُمید لئے بیٹھا ہوں۔ ممکن ہے کہ میری یہ باتیں سماج کی تبدیلی کی محرک واقع ہوں۔ اب مذکورہ نِکات بیان کرتا ہوں:

۴.۱۔ خوش فہمی

---

[6]۔ ۲۰۲۱ء کے دوران تحریک لبیک کے مظاہرے ہوئے اور پورا ملک جام ہوا۔ متعدد مقامات پر مذکورہ تنظیم کے کارکنان اور سیکورٹی فورس آمنا سامنا رہیں، جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے جانی نقصان کے علاوہ املاک کا بھی نقصان ہوا۔ **بحوالہ:** شکیل قرار، عمران گبول، لاہور: ٹی ایل پی اور پولیس میں جھڑپیں، تین اہلکار شہید، متعدد زخمی، مشمولہ: ڈان نیوز، (کراچی، پاکستان)، مورخہ: ۲۳ اکتوبر ۲۰۲۱ء

[7]۔ مشہور ہے کہ جنگِ خندق میں حضرت علی نے جب عمرو بن عبدود کو چت کر دیا اور اُس کے سینے پر سوار ہوگئے۔ قریب تھا کہ آپ اُس کو قتل کر دیتے، وہ گستاخی کا مرتکب ہوا۔ حضرت علی اُس کو قتل کئے بغیر سینے سے اُتر گئے، عمرو بڑا حیران ہوا اور حیرت و استعجاب میں پوچھ بیٹھا کہ آپ مجھے بآسانی قتل کر سکتے تھے، پھر قتل کیوں نہیں کیا تو حضرت علی نے فرمایا کہ مجھے غصہ آگیا تھا اور یہ غصہ اللہ کی رضا کے بجائے میری ذات کے لئے تھا۔ **بحوالہ:** ابن شہر آشوب، ابی جعفر محمد بن علی، مناقبِ آل ابی طالب، ج۲، (بیروت، دارُ الاضواء، ۱۹۹۱ء بمطابق ۱۴۱۲ھ)، ص: ۱۳۲

ہمارے سماج میں اکثر لوگوں کو اُمید و یقین ہے کہ اِس سماج میں تبدیلی آئے گی اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی تمنا لوگوں کے دلوں میں رچ بس گئی ہے۔ گہرائی میں جائیں اور تلاش کریں کہ وہ سب کچھ کیا ہوگا؟ وہ سب کچھ بظاہر کچھ بھی نہیں لگ رہا۔ یہاں حقیقت سے پرے اور دعویٰ سے اُوپر کی نشاندہی ہو رہی ہے جس کو میں "خوش فہمی" کہوں تو زیادہ وضاحت ہو جائے گی۔ نیک خصلت اور بد خصلت انسان کی جنم بھومی کا ازلی استعارہ ہے۔ جس انسان کی نَس نَس میں "ٹھیک ہونا" نہ لکھا ہو، وہ اگر تبدیلی کی مشین سے ڈھل بھی جائے تو کیا ہوگا۔ وہی ہوگا جو ازل سے ہوتا آرہا ہے یعنی کہ تبدیلی کا خواب دیکھتے دیکھتے دُنیا سے رُخصت ہو جانا، ہم سے پہلے کی نسلیں یہی اُمید لے کر چل بسیں کہ ایک دن ایسا ہوگا کہ جب سب کچھ بدل جائے گا اور صبحِ نوید کا آغاز ہوگا، سماج کی بھول بھلیاں معلوم منزل کی رواں دواں ہوں گی اور انسان اپنے حقیقی اہداف کو پالے گا، یہ خام وخیال ہم سے پہلے کے اسلاف کے ذہنوں میں تھا اور وہ ان خیالات کو حقیقی تعبیر سے روشناس کئے بغیر ملک راہی عدم ہوئے۔ آج ہمارا زمانہ ہے، ہم بھی خوابوں اور خیالوں کے مجموعہ ہیں۔ ہم دن رات اِس اُمید کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں کہ شاید نئی صبح کی نوید سنائی دے گی اور ہمارے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔ کیا ایسا خیال اور خواب کا پایہ تکمیل تک پہنچنا قریب ہے یا صرف اُمیدوں کا پٹارہ ہی ہمارا سامانِ سفر ہے؟ یہ سوال مذہب و مسلک اور دین سے کریں تو وہاں صبر اور اُمید کی بڑی نوید ملے گی۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے ہاں یہ خیالات و آراء وسیع معنوں میں موجود ہیں اور ہر خیال کا بنیادی منبع قولِ رسولِ مکرم قرار دیا جاتا ہے۔[8]

۲.۴۔ نقارۂ حق

مسئلہ یہ ہے کہ یہاں آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں تبدیلی کی ضرورت نہیں اور اس تبدیلی کے لئے صدیاں چاہیے۔ ہماری سوچ اور فکر کو جُولانیوں تک لے جانے کے لئے نہ صرف خود کے اندر تبدیلی کی ضرورت ہے بلکہ سماج میں بھی ایک بڑے تغیرُّ کا اہتمام کرنا ہوگا، تاکہ ہر اِنسان اُس تبدیلی اور تغیرُّ کو قریب سے محسوس کر سکے۔ لیکن ہماری سماجی روش اور رِیت یہی ہے کہ یہاں بولنے والے زیادہ اور سُننے والوں کی تعداد قلیل ہوتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ عمل و اتباع اور اطاعت کے حامی

[8] ۔ مسلمانوں کے سبھی فرقے اِس بات کے معتقد ہیں کہ عنقریب ایک بڑے رہنماء (امام مہدی) کی آمد ہوگی اور وہ دُنیا کو اپنی اصلیت کی طرف لے کر جائیں گے۔ قبل ازیں وہ دُنیا ظلم وجور اور مسائل و مشکلات سے بھر چکی ہوگی۔ امام مہدی کے بنیادی وظائف میں یہی ہوگا کہ آپ ظلم میں پسے ہوئے لوگوں کی مدد کریں گے، ظالم و ستم گر افراد سے برابر کا حساب لیں گے۔ بحوالہ: النیسابوری، ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم، المستدرک علی الصحیحین، ج۴، حدیث: ۸۴۳۸، کتاب الفتن والملاحم، (بیروت، دارُ الکتب العلمیۃ ۱۴۲۲ھ بمطابق ۲۰۰۲ء)، ص: ۵۱۲

افراد تو کسی گنتی میں نہیں آتے۔ جب سبھی بولیں گے، سبھی ناصح ہوں گے اور سبھی عالم بالقول (بالعمل نہیں) ہوں گے تو پھر کون نقارۂ حق سمجھے گا۔ کسی کی آواز میں اِس قدر دم خم کہاں کہ وہ مخلوقِ خدا کے کانوں کو سُنا سکے اور اُن کے شعور کو جھنجھوڑ سکے۔ جس سماج میں نصیحت آمیز گفتگو زمان و مکان کے اعتبار سے بہت مختصر ہو وہاں "شعورِ اجتماع" کا تصور بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوگا۔ ہم اکثر مذہبی عبادت گاہوں اور سیاسی جلسہ گاہوں میں بخوبی ملاحظہ کرتے ہیں کہ جو باتیں واعظ حضرات وہاں کرتے ہیں اگر اُنہی باتوں پر عمل کرنے کا آغاز وہ خود اپنی ذات سے شروع کریں تو یقیناً سماجی کیفیت و ہیئت اور "شعورِ اجتماع" کا معیار آسمانوں کی بلندیوں کو چھو رہا ہوگا۔ لیکن صد حیف کہ محراب و منبر اور سیاسی پلانوں پر کئے گئے اعلانات صرف پُر جوش تقریر کا شاخسانہ ہی ہیں۔ اُن کی عملی تصویر کبھی نظر نہیں آتی یا اُن کے ثمرات کبھی دسترس میں نہیں ہوتے۔ لہٰذا سماج کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری آواز، میری باتیں، میری تحریریں اور میرے نصائح اُس وقت تک نقارۂ حق نہیں بنیں گے جب تک کہ میں خود بھی عمل و اتباع،[9] کا حقیقی تصویر نہ بن جاؤں۔

۴.۴۔ سفید پوشاک

ایک طرف سفید پوشاک (وائٹ کالر پڑھا جائے) کی مخلوق ہے کہ جس کے تن من دھن میں بڑائی کا عنصر حد درجہ گھسا ہوا ہے۔ اُن کو پٹی پڑھائی گئی ہے کہ سماجیات کی پوری لین دین اور ذمہ داری تمہارے کاندھوں پر رکھی گئی ہے۔ تم سے شروع ہوگا اور تم پر ہی ختم سمجھو۔ تم بناؤ گے قانون اور تم بگاڑو گے دستور، یہ اَللے تللے قوانین کی سختیاں غریبوں کے لئے اور لاچاروں کے لئے ہیں۔ جو ہر حاکم کے نعروں کو سہارے دیتے ہیں اور فی الفور تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ یہ بے چارے نہیں جانتے کہ جس تبدیلی کے یہ متمنی ہیں اُس کا جنازہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑی شان سے پڑھا جاتا ہے۔

۴.۵۔ سفید پوش

[9]۔ یہاں عمل و اتباع سے میرا منشاء یہی ہے کہ میں اُنہی احکامات پر عمل کروں جن کی نشاندہی قرآن و سیرتِ پیمبرؐ میں کی گئی ہے اور اُن فرامین کی اتباع کروں جن میں حلال و حرام، جزاء و سزاء، ثواب و گناہ اور خیر و شر وغیرہ کا راستہ واضح دکھایا گیا ہے۔ دنیائے عالم کے ایک بڑے دین (دوسرا بڑا مذہب) کے پیروکار کی حیثیت سے میرے پاس کھلی ہدایات ہیں، روشن نما راستے ہیں اور قابلِ توجہ فرامین ہیں۔ اتنی واضح ہدایات کی موجودگی میں میرے پاس کوئی منطقی عذر نہیں کہ میں سرگرداں پھیروں اور جواز تلاش کروں کہ کائنات کے عظیم انسان (محمدؐ) نے میرے لئے زندگی کے قرینہ بیان نہیں کئے۔ (یہ بہت بڑا جھوٹ ہوگا)

ٹھہریئے! اُن سفید پوشوں کو بھی چودہ توپوں کی سلامی دیں جو تبدیلی کی اُمید لئے کبھی اِس شاخ پہ براجمان ہوتے ہیں کبھی اُس شاخ کے اُلو بنتے ہیں۔ اُن کا سفر یونہی چلتا رہتا ہے، چلتا رہتا ہے اور چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ زندگی کی رمق ختم نہ ہوجائے۔ ہمیں اِس قسم کی تبدیلی سے حد درجہ خوف زدہ ہونا چاہیے کہ مبادا یہ تبدیلی ہماری نابود کا سبب نہ بن جائے۔ میرا اشارہ اُن سیاسی کارکنوں کی طرف ہے جو آئے روز سیاسی رہنماؤں کی چکنی چپڑی باتوں کو سنجیدگی کے ساتھ لیتے ہیں اور اُن کے جلسہ گاہوں کی زینت بنتے ہیں۔ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ سیاسی کارندے بہت ہی کم فائدے کے لئے اپنا قیمتی وقت برباد کرتے ہیں بلکہ پوری زندگی داؤ پہ لگاتے ہیں۔ ایسے کارکنوں کو "شعورِ احتماع" کے نصاب سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے۔

۴.۶۔ تبدیلی کا محرک

مُدعی ہیں کہ اس سے قبل جو تھا وہ اب نہیں ہوگا اور آئندہ جو ہوگا وہ ہم سب کے لئے تبدیلی کا بہت بڑا مُحرک ہوگا۔ میں بھی گرویدہ تھا کہ ہاں ہاں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن! میں مایوس ہونا نہیں چاہتا۔ اُمید کو بہت بڑا ذریعہ قرار دے کر خود کو بار بار تسلی دیتا ہوں کہ:

> "یہ جو ہیں بڑے زیرک رہبر ہیں، کر گزریں گے کہ زمانے نبض انہوں نے ٹٹول لی ہے، طوفان کا سا روگ ہوگا، آندھی کی سی مشکل ہوگی۔ پھر بھی ڈٹ جائے گا اور ہر مصیبت کو چُٹکی میں مسل دے گا۔ یہ میری خوش فہمی تھی یا ہے۔ میں سمجھ نہ سکا۔"

۴.۷۔ داعیانِ سیاست

داعیانِ سیاست کہیں گے اُن کو موقع دیا تھا، ہمیں بھی تو وقت چاہیے۔ جمعہ جمعہ ہوا کہ ہم نے اِس رزم گاہ میں قدم رکھا ہے۔ کیا پتہ کہ ہماری تبدیلی کے ثمرات بہت دیر سے ظاہر ہوں۔ ہم نے کہا کہ: بھئی! ہم نے روکا کب ہے کہ ہم سے اجازت نامہ طلب کر رہے ہو؟ پہلے والے بھی آزاد تھے، کھیلتے تھے، منجھے ہوئے کھلاڑی تھے۔ ہر سیاسی چوکا یا چھکا اس شان سے مارتے تھے کہ مخالفین بھی واہ واہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ تم بھی کھیلو، تمہارے کھیل کے ہم ویسے بھی بڑے شائق ہیں۔ مندرجہ بالا گفتگو کے تناظر میں، میں مدعی ہوں کہ سماج میں "شعورِ احتماع" کی بڑھوتری کے لئے ضروری ہے کہ ہم دین و مذہب اور اخلاقیات پر بھرپور توجہ دیں اور اپنی سماجی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھانے کے لئے اسلامی نصاب کو پھر سے پڑھیں۔ وہ وقت الگ تھا جب ہم نے دینِ مبین کو سنی سنائی باتوں کے ذریعے سمجھا، یہ وقت الگ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو ہم نے خود سمجھنا ہے تا کہ سماجی ہیئت و مرتبت میں نمایاں فرق آسکے۔ یہاں پر اُسی عظیم شخصیت (ہادی و رہبرؐ) جس کا ذکر عنوانِ زیرِ بحث کے آغاز میں کیا تھا، کی سیرت سے "شعورِ احتماع" مستعار لیتے ہوئے ہم جدید سماج کی توضیح و تشریح کرتے ہیں اور سماج کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہمارے نزدیک سماج کے عروج و زوال کا اوّلین پیمانہ "تعلیم و تعلّم" ہے۔ ہمارا خیال اِس بُنیاد پر

قائم ہوا ہے کہ ہماری دُنیا کی ترقی یافتہ قومیں اِسی ایک نہج (تعلیم و تعلُّم) کے ذریعے ہم عصر قوموں سے نمایاں ہوئیں۔ جبکہ یہی بات کہ (علم نعمت ہے، راہِ نجات ہے) آج سے چودہ سو سال قبل اللہ کے نبیؐ نے بڑی شد و مد کے ساتھ کہی تھی اور عملی طور پر اِس کا اظہار بھی کیا تھا۔[10] عام مشاہدہ ہے کہ جب تک مسلم سماج تعلیم و تعلّم کی طرف ملتفت رہا، رہنمائی کی دُرست راہیں متعین تھیں، وہ سماج "شعورِ اجتماع" کا پرتُو تھا۔ مغرب سمیت دُنیا کی دیگر اقوام مسلم سماج کی ترتیب شُدہ تعلیمی روش سے مستفیض ہونا ضروری سمجھتی تھی۔[11] جیسے ہی مسلمانوں کا علمی رویہ اور روشِ تحقیق سرد مہری کے شکار ہوئے، زوال کی داستان وہی سے شروع ہو گئی جس کا سلسلہ تاحال جاری وساری ہے۔

ہم کسی ایک قوم کی طرف اشارہ کئے بغیر کہ وہ قوم آج ترقی کی کئی منازل طے کر رہی ہیں، اس بات کی وضاحت کرنا چاہیں گے کہ کوئی ایک انسان ایسا تھا جس نے ہمہ جہت پہلوؤں سے سوچا اور رہنماء اُصول وضع کرنے میں کامیاب ہوا۔ دراصل وہ شخصیت کڑے امتحان کی آماجگاہ اور سخت ترین مسائل و مصائب جھیلنے کی بھرپور قوت رکھتی تھی۔ یہ شخصیت جو متحرک ہے، وہ کیسی ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب کی کھوج کے لئے ہم اپنے ارد گرد ماحول کی طرف نظر دوڑائیں تو تجزیاتی ادراک رکھ سکتے ہیں اور اشارہ کر سکتے ہیں کہ شخصیت کو تعمیراتی مراحل طے کرتے ہوئے سخت تنقید و طنزیہ اُصول سے گزرنا پڑتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ انقلابی فکر و عمل کے متحمل افراد کبھی تنقید سے مبرا رہے ہوں۔ جہاں ایک خاص شخصیت کسی بھی نوعیت کی تنقید سے محفوظ نہ ہو وہاں ایک عام اِنسان تو نقد و جرح سے بریُ الذمہ ہو گا ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ سماج کے نمایاں افراد کئی سو کام کرتے ہیں تبھی اُن کا مقام و مرتبہ بُلند ہوتا ہے۔ لیکن معمولی شخصیت اور حیثیت کے حامل افراد کسی خاص ہدف کا نشانہ نہیں ہوتے، وہ عام سی زندگی گزارتے ہیں اور خاموش کردار کے پرتُو ہوتے ہیں۔ ہمارے آج کے سماج کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ اِس میں تین نظریات بڑی شد و مد کے ساتھ پائے جاتے ہیں:

اول: شخصیت پرستی

[10]۔ جیسا کہ آپؐ نے متعدد مقامات پر تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنی تبلیغی جد و جہد کے آغاز میں جس نظریہ کو وقعت دی وہ تعلیم کا حصول اور اس کی ترسیل تھی۔ یہاں تک کہ جنگوں میں قید کئے گئے افراد کی رہائی بھی "تعلّم" سے مشروط قرار پائی۔ ایسے نبیؐ کی ذاتِ مقدس کو سماج کی تمام تر رعنائیوں اور شعور سے منتھی کرنا، جدید مسلم سماج کے لئے سب سے مفید عمل ہو گا۔ **بحوالہ:** الزھری، محمد بن سعد بن منیع، کتاب الطبقات الکبیر، ج ۲، (القاھرہ، مکتبۃ الخانجی، ۱۴۲۱ھ)، ص: ۲۰

[11]۔ جاوید، پروفیسر ارشد، مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج، (لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص: ۱۹

کسی بھی شخصیت کو مدح و تعریف جیسی صفات سے نسبت دینا عام سی بات ہے۔ میں دعویٰ کرنے لگا ہوں کہ ہمارے سماج میں شخصیت پرستی کا چلن عام ہے۔ ہر کوئی خود کی ذات کے علاوہ اوروں کو سمجھنے، اُن کی زندگی کے باریکیوں کو قریب سے جانچنے کے فراق میں ہوتا ہے۔ آپ کے قریبی افراد آپ کی مدح اِس اعتبار سے کریں گے کہ وہ آپ کی شخصی زندگی اور سماجی حیثیت کو نمایاں کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ بعض اوقات مدح سرائی میں اس قدر رطبُ اللسان ہوتے ہیں کہ وہ صفت ممدوح میں پائی جاتی ہے یا نہیں، وہ بھی یاد نہیں رکھتے۔ اس رائے کے قائم کرنے والے افراد اپنے ممدوح میں خامیاں گنوانے کے حامل بالکل بھی نہیں ہوسکتے۔ یہ ممدوح بھی جانتا ہے کہ تعریف کے جو پُل باندھے گئے ہیں، وہ کچے دھاگوں کی دُکان ہے۔ ہلکی سی ہوا کیا چلنے لگی، پُل ہلنے جُلنے لگتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں خامیاں بالکل بھی عنقاء ہوں اور تعریف ہی تجزیاتی ادراک ہو وہاں شخصیت پرستی کا رُجحان عام ہوتا ہے۔ حقیقت پرستی یا غیر جانب داری کا عنصر بالکل بھی نہیں ہوتا۔ اِس عمل سے بعض اوقات ممدوح کی صلاحیتوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ جہاں تک صلاحیتوں کو اُبھارنے کا موقع ملا تھا وہاں تک قدغن لگ جاتا ہے، مزید کی گنجائش نہیں رہتی۔ غور کریں دینی یا دنیاوی علوم کے طالب علم جب سیکھنے کی گہرائی تک جاتے ہیں اور اس دوران اُنہیں کسی مقام (محراب و منبر، یا سیاسی اکھاڑے میں) پر بولنے کا موقع ملتا ہے تو وہ پوری شان و عظمت کے ساتھ اپنا جوہر سامنے رکھتے ہیں، چاہے وہ خطابت کی صورت میں ہو یا علوم کی تفسیر کی صورت میں، پہلے پہل کا اظہارِ خیال تعریف و توصیف کو متعین کرنے کا ابتدائی قرینہ ہوتا ہے۔ وہ شخص کہ جس نے بڑے طمطراق سے محراب و منبر سنبھالا، سیاسی گدی نشینی کا وارث ہوا یا مُدرسی کی مسند پر براجمان ہوا، وہ تعریف کی صورت میں ملنے والی واہ واہ کی نذر ہوجاتا ہے۔ اچھا خاصا علم کی طلب اور شوق میں نکلا تھا، تعریف و توصیف نے پَر کاٹ دیئے ہوتے ہیں۔ یہ تعریف اگرچہ بے دھیانی میں کی جاتی ہے لیکن اس سے ممدوح کی صلاحیتیں ختم اور وہ مزید طلب کے عمل سے بے گانہ ہوجاتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ حوصلہ افزائی کے لئے تعریف ضرور کی جانی چاہیے لیکن اس قدر نہیں کہ ممدوح کی خامیاں ہی پسِ پردہ چلی جائیں۔ لہٰذا سماج میں رواء یہ عمل کہ اپنے ہی کسی عزیز یا رشتہ کی ہر حال میں تعریف کرنی ہے، تعمیری مُسابقت کو پروان چڑھانے کے بجائے اقربا پروری کی روایت قائم کرتا ہے۔ جس سماج میں قرابت داری کا عنصر قائم ہو وہاں شخصی تعمیر سے لے کر اجتماعی ذہن سازی کی ساری رونق ماند پڑ جاتی ہے، نتیجتاً وہ سماج مُتحرک رہنے کے بجائے منجمد ہوجاتا ہے۔

پاکستانی سماج کو اِسی تناظر میں دیکھا جائے تو صورت حال بالکل واضح ہوجائے گی۔ ۶۰ء اور ۷۰ کی دہائی سے قبل پاکستان اپنی کثیر الجہت تنوع کے اعتبار سے پختہ اور تعمیری راہ پر گامزن تھا۔ قریبی تعلق کو مدِ نظر رکھنے کے بجائے باصلاحیت افراد کو اعزاز بخشنے کی روایت عام تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اپنے کسی عزیز یا قرابت دار کو تعریف کی اُونچی مسند پر بیٹھانے کے لئے نوازا جاتا، بلکہ مستحق اور قابل افراد ہی

متعلقہ ذمہ داری نبھانے کے اہل قرار پاتے تھے، وجہ صاف ظاہر تھی کہ اُس وقت قومی رہنماء متحرک و فعال تھے، مشہور ملکی بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب آغازِ پاکستان کی مشکلات اور لوگوں کے جذبۂ حُب الوطنی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"...دفتروں کے روایتی ساز و سامان سے بڑی حد تک محروم تھے۔ فائلوں کے لئے نہ زیادہ الماریاں تھیں نہ شیلف، عام طور پر پتھر کی سِلوں کو ہموار رکھ کر ان سے کام لیا جاتا تھا۔ موسم کے لحاظ سے باہر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر دفتری کام کرنے کا رواج تھا۔ دن بھر بھارت کے بمبار طیارے ہمارے اوپر سے یا دائیں بائیں پرواز کرتے ہوئے گزر جاتے تھے اور اپنے نشانوں پر اندھا دھند بم برسا کر خراماں خراماں واپس لوٹ جاتے تھے۔ ہماری جانب سے ان کی مزاحمت یا روک تھام کا کوئی بندوبست نہ تھا...ان کے مقابلے میں ہمارا سہارا صرف اللہ پر توکل تھا۔ جب کبھی بھارتی طیارہ آس پاس بم برساتا یا مشین گن سے بے تحاشا گولہ باری کرتا عین ہمارے اوپر سے گزرتا تھا تو ہم دم سادھ کر اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھ جاتے تھے۔"[12]

یہ اُس پاکستان کی تصویر کشی ہے جو ابھی ابھی اپنا آغاز کر رہا تھا۔ اب جبکہ پاکستان ہنرمندی اور علوم و فنون میں کافی دسترس حاصل کر چکا ہے، پھر بھی صورت حال جوں کی توں ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ساٹھ اور ستر کی دہائی سے قبل پاکستان کی ترقی میں تحرُّک تھا، پاکستانی سماج سخت مشکلات کے باوجود قدم آگے بڑھا رہا تھا لیکن مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد ہمارے سماج کو گھن لگ گیا اور ملک میں ترقی کے بجائے تنزلی کا عنصر غالب آگیا اور قوم آج تک نفسیاتی سکتے میں ہے۔[13] اس پر مستزاد یہ کہ جیسے جیسے وطنِ عزیز پاکستان عمر اور تجربہ کے اعتبار سے بُزرگ ہوتا گیا ویسے ویسے اقربا پروری، بدعنوانی اور عزیز داری نے اس سماج کی وضع قطع متزلزل کر دی۔

دوم: ناقدانہ عمل

ہم سماج میں مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ بعض افراد دُنیا میں آئے ہی اس لئے کہ وہ دیگر لوگوں کی مذمت کر سکیں۔ ان لوگوں کے نزدیک سماج میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو مدح کے لائق ہو۔ ان لوگوں نے خاص طور پر علومِ دینی کے حامل افراد کو نشانہ بنا رکھا ہے۔ علومِ دینی کے حامل کسی طالب علم سے بھول

---

[12] ۔شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء)، ص:۴۰۲

[13] ۔صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان کیوں ٹوٹا؟، (لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰ء)، ص:۲۲۹

چُوک کیا ہوئی فوراً مذمتی توپوں کا رُخ علماء کی طرف ہوجاتا ہے۔ حالانکہ سماج میں صرف علمِ دین کے حامل افراد تو نہیں۔ یہاں عصری علوم حاصل کرنے والے طالب علم بھی تو ہیں۔ کیا اُن کی شخصیت سے سرزد شُدہ غلطیاں کسی گنتی میں نہیں آتی؟ یہ غیر متوازی ادراک اس لئے بھی رائج ہے کہ اس سماج میں مذمت کرنے والے افراد کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ کبھی ہم نے غور کیا کہ پڑوس یا آس پاس میں رہنے والے افراد کی خامیاں اور غلطیاں کسی بھی طور اس لئے لائقِ مذمت ہیں کہ وہ خامیاں اور غلطیاں ہمیں اپنی ذات میں نظر نہیں آتیں؟ کبھی فرصت ملے تو ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا ادراک کرنا ہوگا کہ جس طرح ایک دینی طالب علم سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اسی طرح ہم سے بھی غلط کام یا نقص ہوسکتا ہے، قطعِ نظر کہ ہم زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

سوم: رائے زنی

بالواسطہ کسی شخص کے بارے میں خود ساختہ ایک رائے قائم کرنا، عام زبان میں رائے زنی کہلاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو کسی ایسے گناہ کی طرف نسبت دینا جبکہ وہ گناہ اُس سے سرزد نہ ہوا ہو تو یہ رائے زنی سے بھی بڑھ کر ایک عمل ہوگا جس کو الزام بھی کہہ سکتے ہیں۔ رسول اللہ ؐ سے منقول ہے کہ جس شخص کی چوری ہوئی ہو اور وہ اِس کا الزام بے گناہ افراد پر لگائے تو اِس کا گناہ چور کے گناہ سے بھی بڑا ہے۔[14] یعنی اگر آپ بالمُشافہ کسی شخص سے جان پہچان نہیں رکھتے، اُس کی شخصیت کے بارے میں جانکاری نہیں ہے، لیکن کسی نے آپ کو بتایا کہ فلاں شخص کردار و عمل کے اعتبار سے ڈھیلا ڈھالا ہے۔ وہ اپنی علمیت (اگر وہ شخص پڑھا لکھا ہے تو) کے پسِ پردہ گھناؤنے فعل انجام دیتا ہے، یہ رائے انتہائی نازک مرحلے کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہم کیسے کسی شخص کو اچھائی یا بُرائی کی کسوٹی میں پرکھ سکتے ہیں حالانکہ ہم نے اُس شخص کو قریب سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اُس کے کردار کے عینی شاہد ہیں۔ اُصولاً تو کسی شخص کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے سے قبل بالمُشافہ اس سے ملاقات کی جائے اور گفتگو و شنید سے اندازہ لگایا جائے کہ واقعی میں یہ شخص ایسا نہیں ہے جیسا سُنا گیا تھا۔ کوئی شخص کسی کے خیالات، احساسات اور جذبات کا ترجمان ہرگز نہیں ہوسکتا۔ خاص طور پر ایسی صورت حال میں جب آپ کسی شخص کے بارے میں اُس کے مخالفین سے رائے لیتے ہیں۔ مخالف شخص تو کبھی بھی تعریف نہیں کرسکتا، اُس کی تو ہمہ جہت کوشش ہوتی ہے کہ ہر پہلو سے اپنے مخالف کی شخصیت و کردار کو داغدار کرے۔ آج کے پاکستانی سماج میں یہ چلن بھی عام ہے۔ اس عمل سے جہاں غلط فہمیاں عروج پر ہوتی ہیں وہیں ناراضگی کا عنصر بھی غالب آجاتا ہے۔ دوسری جانب دینِ اسلام کی تعلیمات میں اِس قسم کی روش کی سخت نفرین کی گئی ہے اور قرار دیا گیا ہے کہ

---

[14]۔ بہارانچی، محمد حسینی، مُحرماتِ اسلام، (کراچی، جامعہ تعلیماتِ اسلامی، ۲۰۱۳ء)، ص: ۲۱۵

"رائے"، "الزام"، "تہمت"، یا غیبت جیسے گناہانِ جہاں انسانی ساخت کو بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں وہی سماج کی بربادی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی شخص میں موجود خامی کا تذکرہ بھی غیبت ہے اگر نہ ہو تو پھر وہ تہمت شمار ہو گی۔[15]

عجیب افراتفری مچی ہے۔ انسانی سماج کے بازار میں انسان کا جنازہ بڑے دھوم دھام سے روز نکلتا ہے۔ ہر اِک سازشی ہے تو ہر اِک منصوبہ ساز، کہیں پہ ہمدردی کے دو بول نہیں۔ ہر شخص ہے کہ مفادات کی راہ پر چل پڑا ہے۔ محلوں، بازاروں اور چوراہوں پر نظر رکھیں، آپ کو تنقیدی اور تخریبی سوچ بکھیری ہوئی نظر آئے گی۔ کلیدی اداروں میں جاری محلاتی سازشوں کی تو ایک طویل تاریخ ہے۔ گروپ بندی، اجتماع بندی اور میلانِ قلبی کا وہ حیران کُن نظارہ دیکھنے کو ملے گا کہ پناہ بہ خدا کہ اُس منظر کو سمجھنے کے لئے عمرِ نوحؑ[16]، صبرِ ایوبؑ[17]، تکلّمِ موسیٰؑ[18]، جلالِ محمد مصطفیٰؐ[19] بھی کم پڑ جائے۔ ایک شخص اپنے مفاد کی جنگ اس قدر شان سے لڑتا ہے کہ اُس کو نہ صحیح غلط کی تمیز ہوتی ہے نہ حلال حرام کی کوئی پرواہ، اکیلے میدانِ زندگی کا شہسوار بن کر اُچھلتا ہے، کودتا ہے اور سازشیں تیار کرتا ہے، دوسرا شخص پہلے والے شخص کے تمام منصوبے ملیامیٹ کرنے کی نیت سے آگے بڑھتا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ مجھے نہیں ملا ہے تو تجھے بھی ملنے نہیں دوں گا۔ وہ منفعت تمہارے لئے کیونکر قابلِ استعمال ہو جو میرے لئے قابلِ رسائی نہ ہو۔ بعض اوقات جیتنے اور فاتح بننے کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے، یہ جیت زندگی اور موت کی حدود متعین کر جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر جیت ممکن نہ ہوئی تو گویا ایسا ہے جیسے نظام کے نظام درہم برہم ہو جائیں، جیسے کہ نظریئے کے نظریئے ڈھیر ہو جائیں، جیسے کہ سماج کے سماج اُکھڑ جائیں۔ دوسری طرف اس کے برعکس خیال ہوتا ہے۔ وہاں ایک گروپ خیال کرتا ہے کہ ضمیر کے ضمیر بھٹکنے لگے ہیں، شریف کے شریف

---

[15]۔ القرضاوی، یوسف، اِسلام میں حلال و حرام، مترجم: شمس پیرزادہ، (لاہور، اِسلامک پبلی کیشنز [پرائیویٹ] لمیٹڈ، ۱۹۷۶ء)، ص:۳۹۱

[16]۔ حضرت نوحؑ نے قوم کی ہدایت کے لئے ساڑھے نو سو سال لگا دیئے پھر بھی چند ہی لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ **بحوالہ:** دمیری، محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ، حیات الحیوان، ج۱، (لاہور، مکتبۃ الحسن، ۲۰۰۶ء)، ص:۳۸

[17]۔ حضرت ایوبؑ بطور امتحان حد درجہ تکلیف میں مبتلا ہوئے، آپؑ تاریخِ انسانیت کے صابر انسان ہیں۔ بحوالہ: مسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، تاریخِ مسعودی، (کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۵)، ص:۶۶

[18]۔ حضرت موسیٰؑ کو خدا سے تکلم کا شرف حاصل ہے۔ علاوہ ازیں یہی وہ نبی ہیں کہ جنہوں نے خدا سے خدا کے دیدار کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ **بحوالہ:** ابی شیبہ، ابی بکر عبداللہ بن محمد، مُصنف ابنِ ابی شیبہ، ج۹، حدیث:۳۲۴۹۸، مترجم: محمد اویس سرور، (لاہور، مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۱۴ء)، ص:۴۲۶

[19]۔ جلالِ مصطفیٰؐ کے لئے یہی جملہ کافی ہے کہ آپ جملہ انبیاء کی نبوتوں و رسالتوں کے تتمہ و تکملہ تھے۔ ﷺ طبرسی، ابی علی الفضل بن الحسن، اعلام الوریٰ باعلام الھدیٰ، (بیروت، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ۱۴۲۴ء بمطابق ۲۰۰۴ء)، ص:۲۲

ریاض

بکنے لگے ہیں، فطین سے فطین بھی مُکرنے لگے ہیں۔ یہاں وعدوں کا پاس ہے، عزت داروں کا لحاظ ہے اور نہ ہی ایمانداری کا کوئی مول، بس! زمانے کی تیز ہوائیں ہر چیز کو لے اُڑنے کی فراق میں ہیں۔ کیا مثال دینے کی ضرورت ہے کہ جب دارُالخلافہ اسلام آباد کی ایک اہم نشست بہت سارے گروپوں پر مشتمل ایک گروپ (پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ) کی نامی گرامی شخصیت نے جیت لی[20] پھر تو کیا تھا، دونوں جانب سے اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے قول و نظریات کی بھرمار ہوئی۔

ایک جماعت مُدعی ہوئی:

> "آج جمہوریت نے فتح کی ایک اور چادر اوڑھ لی۔ دنگا فساد اور گولیوں سے بدلہ لینے کے بجائے "بہترین" جمہوریت کے ذریعے بدلہ لیا گیا۔"[21]

دوسری جماعت جس نے شکست کا مزہ چکھا تھا، تھوڑی بہت مایوس بھی تھی اور اپنے غمگین لہجے میں کہنے لگی:

> "آج پیسہ جیت گیا اور ضمیر کو مات دے دیا۔ مخالفین نے ہر اُس حربے کو استعمال کیا جس سے اُن کی جیت یقینی ہو سکتی تھی۔"[22]

غرض یہ کہ پاکستانی سماج میں سازشوں کا پنڈورا باکس ہر وقت کھلا رہتا ہے اور یہ پنڈورا باکس تعمیری اور انسان ساز عمل کے لئے قطعاً نہیں ہوتا بلکہ تخریب کاری کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ذاتی مفادات کا اسیر ضرور ہے لیکن حق گوئی اور حق شناسی کی جُرأت ہم میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ نہیں معلوم ہماری یہ روش جو ہمیں دن بدن پستی کی طرف دھکیل رہی ہے، کب دُرست راہ پر گامزن ہوگی۔ نہ جانے کب ہم محلاتی سازشوں سے باہر نکلیں گے اور اجتماعی مفادات کو ترجیح دیں گے۔ ہم میں

[20]۔ مارچ ۲۰۲۱ء میں پاکستان کے ایوانِ بالا (سینیٹ) کے انتخابات ہوئے، مذکورہ انتخابات میں اگرچہ اُس وقت کی حکمراں جماعت پاکستان تحریک انصاف کو اکثریت ملی تاہم اسلام آباد کی اہم نشست پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (پی ڈی ایم) کے مشترکہ اُمیدوار یوسف رضا گیلانی نے اُچک لی۔ فاتح اُمیدوار نے مدِ مقابل پاکستان تحریک انصاف کے ڈاکٹر حفیظ شیخ کو شکست دے کر مذکورہ نشست حاصل کرلی تھی۔ **بحوالہ:** غالب نہاد، یوسف رضا گیلانی اسلام آباد سے سینیٹ کی نشست جیت گئے، عبدالحفیظ کو شکست، مشمولہ: ڈان نیوز، (کراچی، پاکستان)، مورخہ: ۴مارچ ۲۰۲۱ء

[21]۔ ویب ڈیسک، "سینیٹ الیکشن میں اپ سیٹ: وزیراعظم عمران خان کا پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ لینے کا فیصلہ، بی بی سی اُردو لندن: بی بی سی، 3مارچ 2021ء، https://www.bbc.com/urdu/pakistan-56261981

[22]۔ ویب ڈیسک، "سینیٹ الیکشن میں اپ سیٹ: وزیراعظم عمران خان کا پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ لینے کا فیصلہ، بی بی سی اُردو، محولہ بالا

سے ہر شخص اچھائی کا طلب گار ضرور ہے لیکن ہمارے اعمال، حرکات و سکنات ہماری طلب کے بالکل برعکس ہیں۔ ہم زبانی کلامی "بہت اچھا" کی صدا بلند کرتے ہیں جبکہ اُس "بہت اچھا" کا حصہ دار نہیں بننا چاہتے۔

۵۔ خُلاصہ بحث

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ مذہبی تحقیق کے اعتبار سے جمود کا شکار ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے افراد بھی گوارہ نہیں کرتے کہ جن مذہبی نظریات کو بُنیاد بنا کر اپنے مخالف کو گمراہ قرار دیا جا رہا ہے، وہ منطقی طور پر ثابت شُدہ ہیں یا نہیں۔ بعض اوقات اپنے مسلک کو درست ثابت کرنے لئے تاریخی کہانیاں، مافوقُ الفطرت واقعات کی نسبت بیان کی جاتی ہے۔ فی زمانہ بہترین زبان و ادب کے حامل افراد ذہن سازی کرتے ہیں، اُن کی چرب زبانی اس قدر مقبول ہوتی ہے کہ سامعین میں سے اکثر اُس مقرر کی بات کو حرفِ آخر سمجھتی ہے۔ نتیجتاً ایک ایسا ماحول پیدا ہوتا ہے جہاں شخصی و مسلکی تنقیص کے ساتھ ساتھ قتل و غارت گری آسان امر بن جاتا ہے۔ متمدن دُنیا میں ایک چیز بڑی واضح ہے کہ وہاں اپنے ملک و قوم اور سماج کے لئے عمیق جذبہ پایا جاتا ہے جبکہ ہمارا سماج جو کہنے کو تو اسلامی تعلیمات سے مزین ہے لیکن عمل و اخلاق میں وسیع خلیج موجود ہے، یہ ابھی سیکھنے اور بگڑنے کی صورتِ حال سے گزر رہا ہے، کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی "جائز سیاست" کے نام پر مسلم سماج کا امتحان ہر آن چل رہا ہے۔ مسلک و فرقہ، مذہب و دین اور ذات رنگ و نسل کی تمام جھلکیاں پاکستانی سماج میں بخوبی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ ہر مسلک کے نزدیک بعض بنیادی چیزیں ہیں اور وہ مُسلماتِ دین کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن مُبادیات کے تانے بانے بہر حال کائنات کے سب سے عظیم انسان حضرت محمدؐ سے ملتے ہیں۔ جب بنیادی ذریعہ کہ جس کی پہچان ہم دو منابع کی صورت میں کر سکتے ہیں یعنی ایک کلام عظیم اور دوسرا ذاتِ پیغمبرِ عظیمؐ، ان دونوں کی موجودگی میں ضروری ہے کہ ہمیں دیگر مذہبی آثار و ایام اور معاملات پر بات کرنے سے قبل ہزار بار سوچ و فکر ہونی چاہیئے، اس لئے کہ ایک مسئلہ آپ کے لئے ایمانیات کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسری جانب وہی مسئلہ کسی اور کے لئے سطحیات کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا دل آزاری سے اجتناب کرتے ہوئے اور سب و شتم کا سہارا لئے بغیر وہ کام کریں جس سے باہمی احترام کا جذبہ اُمڈ آئے۔ پاکستانی سماج اُن تمام اختلافات و اِفتراقات کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ اگر وہ جاری و ساری رہیں تو دست و گریباں کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں ہمیشہ اختلافِ رائے کو صرف تحقیق کی نیت سے قابلِ قبول سمجھنا چاہیے۔ وگرنہ کسی کو مذہبی اعتبار سے غلط اور ناحق قرار دینے کی کوشش ہوئی تو نتیجہ سامنے ہے کہ پھر مسلکی دوریاں ہوں گی اور فروعی اختلافات کو سامنے رکھ کر اپنے مخالف کو بخشنے کی روش ختم ہو جائے گی۔

ایسا کیوں ہے کہ مذہبی جنونیت کا عنصر پاکستانی سماج میں کچھ زیادہ ہی سرایت کر چکا ہے۔ اگر طائرانہ

نظر دوڑائیں اور تجزیہ و تحلیل کی طرف رُجوع کریں تو واضح ہو جائے گا کہ مذہب پرستوں نے اپنے تئیں ایک قانون وضع کر لیا ہے اور یقین کر لیا ہے کہ جنت و جہنم کی تقسیم کا منطقی جواز اور سزا و جزاء میں تخفیف و تکثیر کے تانے بانے مخالف مذہب و مسلک کی تنقیص و تکفیر میں پوشیدہ ہیں۔ حالانکہ سزا و جزاء کا تعلق جنت کے حصول سے قبل انسانیت خاص طور پر صلہ رحمی کے ساتھ مضبوط ربط اور سماجیانہ عمل سے ہے۔[23] اللہ نے تو یہ نہیں کہا کہ خبردار! صرف مسلمانوں پر ظلم مت کرنا باقی کسی کے ساتھ ظلم کرو گے تو وہ معاف ہے۔ ظاہر ہے کہ ظلم ظلم ہی ہے چاہے یہ مسلم کے ساتھ ہو یا غیر مسلم کے ساتھ، حساب و کتاب تو ہوگا خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسا کہ ۲۰۲۱ء میں رونما ہونے والا "سیالکوٹ واقعہ"[24] اِس کی مثال ہے۔ وہ تمام افراد اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے جنہوں نے سیالکوٹ واقعہ میں مذہبی جنونیت دیکھائی اور ایک انسان کے قتل میں ملوث قرار پائے۔ اُن سے پوچھا جائے گا کہ وہ ایک انسان تھا اور انسان ہونے کے ناطے وہ ظلم و بربریت سے مبرا تھا، پھر یہ ظلم کیوں ہوا؟ یہ سوال دراصل حساب و کتاب کی ایک شکل ہے۔ یہاں پر حدیث کا ایک مفہومی پیراگراف نقل کر رہا ہوں۔ بتایا گیا:

> "ایک مرد دوسرے مرد کا ہاتھ تھامے آئے گا اور کہے گا: اے میرے رب! اس نے مجھے قتل کیا تھا، تو اللہ فرمائیں گے: تو نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ عرض کرے گا کہ میں نے اس لئے اسے قتل کیا کہ آپ کے (دین) کا غلبہ ہو تو اللہ فرمائیں گے کہ عزت و غلبہ تو میرے لئے ہے، (اسی طرح) ایک شخص دوسرے شخص کا ہاتھ تھامے آئے گا، وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! اس نے مجھے قتل کیا تو اللہ فرمائے گا: تو نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ عرض کرے گا تاکہ فلاں کے لئے غلبہ ہو تو

[23] ۔ اسلامی تعلیمات میں "حقوق العباد" کے عنوان سے ایک پورا باب تقریباً تمام فقہی کتابوں میں مترتب نظر آتا ہے ۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانیت کا احترام و تقدس بنیادی چیز ہے۔ اُنہی کتابوں میں لکھا ہے کہ حقِ انسانیت و حقِ صلہ رحم موجبِ جنت ہے اور قطعِ رحم موجبِ جہنم ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور صلہ رحمی کرو۔ بحوالہ:

قادری، سید احمد عروج، قرآن کا فلسفۂ اخلاق، (نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۲۰۱۴ء)، ص: ۱۵۰

[24] ۔ ۳ دسمبر ۲۰۲۱ء کو سیالکوٹ کی ایک فیکٹری میں توہینِ مذہب کے نام پر مشتعل ہجوم کے ہاتھوں سری لنکن شخص کا قتل ہوا۔ وہ مقامی فیکٹری میں بطور جنرل مینجر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ الزام یہ تھا کہ مذکورہ شخص نے تقدس پر مبنی اسٹیکرز، جو دیوار پر چسپاں تھے، اُکھاڑ کر پھینکا تھا۔ یہاں تک کہ بعض نازیبا الفاظ کی ادائیگی بھی کی تھی۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد مشتعل ہو گئی۔ سری لنکن شخص کے خلاف نعرے لگے اور مشتعل ہجوم نے حملہ کیا اور بعد ازاں وہ شخص اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ **بحوالہ:**

◉ ویب ڈیسک، سیالکوٹ میں توہینِ مذہب کے الزام میں سری لنکن شہری کا قتل، مشمولہ: بی بی سی اُردو ویب سائٹ، (برطانیہ لندن)، مورخہ: ۴ دسمبر ۲۰۲۱ء

ریاض

اللہ فرمائے گا: تو وہ فلاں کے لئے نہیں، یوں وہ اپنے گناہ کی وجہ سے (سزا کا) مستحق ہوگا۔"[25]

بنابرایں اُس قرآنی آیت کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ جس میں ایک انسانیت (نہ کہ مسلمانیت) کا قتل پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا ہے۔[26] اس ایک جملے میں انسانیت کی حقیقی معرفت بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ سری لنکن غیر مسلم منیجر جنت جائے نہ جائے لیکن اُن مسلمان قاتلوں سے حساب وکتاب ہوگا۔ ہم نے مذہب و سماج کے تال میل کو محققانہ و تجزیانہ انداز میں جائزہ لیا اور اُس تال میل کو "شعورِ اجتماع" سے نتھی کرتے ہوئے قرار دیا کہ سماج میں ہماری ذمہ داری کا تعلق ہمارے اخلاص سے ہے اور وہ اخلاص ہمارے عمل کی گواہی دے تو ہم سماج میں مذہب و سیاست کے درست پیمبر ثابت ہوں گے اور اگر ہمارے اخلاص اور عمل میں مطابقت نہیں رہی تو پھر "شعورِ اجتماع" کا تصور بھی عنقاء ہو جائے گا۔

کتابیات

ابی بکر عبداللہ بن محمد، مصنف ابنِ ابی شیبہ، ج ۹، حدیث: ۳۲۴۹۸، مترجم: محمد اویس سرور، (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۱۴ء)۔

ابن شہر آشوب، ابی جعفر محمد بن علی، مناقبِ آل ابی طالب، ج۲، (بیروت: دارُ الأضواء، ۱۹۹۱ء/ ۱۴۱۲ھ)۔

النیسابوری، ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم، المستدرک علی الصحیحین، ج ۴، حدیث: ۸۴۳۸، کتاب الفتن والملاحم، (بیروت: دارُ الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۲ء/ ۱۴۲۲ھ)۔

الزہری، محمد بن سعد بن منیع، کتاب الطبقات الکبیر، ج۲، (قاہرہ: مکتبۃ الخانجی، ۱۴۲۱ھ)۔

المسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، تاریخ مسعودی، (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۵ء)۔

قرضاوی، یوسف، اسلام میں حلال و حرام، مترجم: شمس پیرزادہ، (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۷۶ء)۔

الطوسی، ابی جعفر محمد بن الحسن، تہذیب الاحکام، ج۶، (بیروت: دارالتعارف للمطبوعات، ۱۹۹۲ء)۔

الطبرسی، ابی علی الفضل بن الحسن، اعلام الوریٰ باعلام الھدیٰ، (بیروت: موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ۲۰۰۴ء/ ۱۴۲۴ھ)۔

بہارانچی، محمد حسینی، محرماتِ اسلام، (کراچی: جامعہ تعلیماتِ اسلامی، ۲۰۱۳ء)۔

جاوید، پروفیسر ارشد، مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج، (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۱۰ء)۔

دمیری، محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ، حیات الحیوان، ج۱، (لاہور: مکتبۃ الحسن، ۲۰۰۶ء)۔

کراروی، سید نجم الحسن، تاریخ اسلام، (لاہور: امامیہ کتب خانہ، ۱۹۷۴ء)، ص: ۵۸۔

قادری، سید احمد عروج، قرآن کا فلسفۂ اخلاق، (نئی دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۲۰۱۴ء)۔

---

[25]۔ ہندی، علاء الدین علی متقی بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، ج:۸، حدیث: ۳۹۹۰۹، مترجم: احسان اللہ شائق، (کراچی، دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء)، ص: ۲۹

[26]۔ القرآنُ الکریم، سورہ مائدہ: ۵، آیت: ۳۲

قادری، ڈاکٹر محمد طاہر، منہاج القرآن، (لاہور: منہاج القرآن پبلیکیشنز، ۱۹۹۵ء)۔
سیوطی، جلال الدین، الخصائص الکبریٰ فی معجزات خیر الوریٰ، ج ۱، مترجم: سید غلام معین الدین نعیمیؒ، (لاہور: مکتبہ اعلیٰ حضرت، ۲۰۰۶ء/۱۴۲۶ھ)۔
شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء)۔
صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان کیوں ٹوٹا؟، (لاہور: جنگ پبلیکیشنز، ۱۹۹۰ء)۔
ہندی، علاء الدین علی متقی بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، ج ۸، حدیث: ۳۹۹۰۹، مترجم: احسان اللہ شائق، (کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء)۔